درس ۲٦

اُمّتِ مُسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۴)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۞ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۞ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۞ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۚ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا ۚ وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ۚ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۞ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۞ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ ۚ وَھُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۞﴾ ......صدق اللّٰہ العظیم

''تسبیح بیان کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور وہی ہے زبردست کمال حکمت والا۔ اسی کے لئے بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین کی' وہی زندہ کرتا ہے' وہی مارتا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ وہی اوّل ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے اور وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ اس

کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ اور جو کام تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اسی کے لئے بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین کی' اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں' اور وہ سینوں کے پوشیدہ راز تک جانتا ہے۔''

حدیثِ نبویؐ سے راہنمائی

گزشتہ نشست میں ہم تیسری آیت پر گفتگو کر رہے تھے۔ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ کے بارے میں ہمیں حدیثِ نبویؐ سے بھی راہنمائی ملتی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحیح مسلم اور مسند احمد بن حنبل میں آئی ہے۔ نیز قاضی ابویعلیٰ نے اسے اپنی ''مسند'' میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ یہ اصل میں حضور ﷺ کی ایک دعا ہے:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الظَّاھِرُ فَلَیْسَ فَوْقَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَکَ شَیْءٌ

''اے اللہ! تو ہی وہ اوّل ہے جس سے پہلے کچھ نہیں۔ اور تو ہی وہ آخر ہے جس کے بعد کچھ نہیں ہوگا۔ تو ہی ظاہر ہے' تجھ سے بڑھ کر نمایاں کوئی نہیں اور اے اللہ! تو ہی باطن ہے کہ تجھ سے زیادہ مخفی کوئی نہیں!''

آپ حدیث کے ان الفاظ پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ حضور ﷺ کی اس حدیث نے اس نہایت ثقیل' نہایت دقیق اور نہایت مشکل مضمون کو بہت سہل اور آسان بنا دیا۔ چنانچہ اس حدیث کے حوالے سے انسان بآسانی یہاں سے گزر جائے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ غور کرنے والے کے لئے اس میں اشکالات موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو الفاظ ہمارے پاس ہیں ان کا اپنا ایک connotation اور مفہوم ہوتا ہے

اور یہ الفاظ چونکہ ہماری زبان کے ہیں' لہٰذا ان کا وجود ہمارے اپنے تصورات کے مطابق ہوتا ہے۔ جب ہم کسی شے کو کہتے ہیں کہ یہ پہلی چیز ہے' اس سے پہلے کچھ نہیں' تو اس کے بارے میں خواہ مخواہ ایک تصور پیدا ہو جاتا ہے کہ اس شے کا گویا اپنا کوئی نقطہ آغاز ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ پہلا مکان ہے' اس سے پہلے کچھ نہیں ہے' مگر اس سے پہلے خلا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ہم یہ تصور قائم نہیں کر سکتے کہ اس کے وجود کا کوئی نقطہ آغاز بھی ہے۔ اس سے پہلے کوئی عدم نہیں تھا۔ لیکن اس کی تعبیر کے لئے ہم الفاظ کہاں سے لائیں؟ کسی ایسی ہستی کی تعبیر کے لئے جو ہمیشہ سے ہو' ہمارے پاس کوئی لفظ ہے ہی نہیں۔ اصطلاح میں ہم لفظ ''قدیم'' اختیار کرتے ہیں' لیکن قدیم کے عام معنیٰ پرانی شے کے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ فلاں شہر بڑا قدیم شہر ہے' فلاں تہذیب بڑی قدیم تہذیب ہے' لیکن اس کے یہ معنیٰ تو نہیں ہو سکتے کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔ یہ مفہوم تو ہمیں اضافی طور پر اصطلاح میں داخل کرنا پڑا' یہ ہماری مجبوری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری زبان میں وہ الفاظ ہی موجود نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مطلق کی صحیح تعبیر کر سکیں۔

آپ حدیث کے الفاظ پر غور کیجئے۔ فرمایا: ''وَاَنتَ الْآخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ'' یہاں حضور ﷺ نے لفظ ''بَعْدَکَ'' ارشاد فرمایا ہے' لیکن کیا اللہ کے بعد کا کوئی تصور ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اللہ کے بعد کا کوئی تصور نہیں۔ اللہ تو ہمیشہ سے ہے' نہ کوئی لمحہ کبھی ایسا تھا کہ جب اللہ نہیں تھا اور پھر اس کے وجود کا کوئی آغاز ہوا ہو' اور نہ کوئی لمحہ کبھی ایسا آ سکتا ہے جب کہ اللہ کا وجود نہیں ہوگا' لیکن اس حقیقت کی تعبیر کے لئے سادہ الفاظ وہی ہوں گے جو حضور ﷺ نے اختیار فرمائے:

اَنتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ
وَاَنتَ الْآخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ

پھر یہ کہ ان الفاظ کے اندر از خود ایک احتیاج موجود ہے' اوّل وآخر کے الفاظ کوئی اضافی نسبت طلب کرتے ہیں کہ کس کا اوّل؟ کس کا آخر؟ یہ الفاظ اس خطبے میں بھی آئے ہیں

جو حضور ﷺ نے شعبان کے آخری دن رمضان المبارک کے استقبال کے ضمن میں اس کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے دیا تھا۔ اس خطبے میں آپ ﷺ نے ''اوّل و آخر'' کو رمضان المبارک کے مہینے کے ساتھ نسبت دی: ((اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَآخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ)) یعنی اس مہینے کا اوّل اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے' درمیانی حصہ اللہ کی مغفرت کا مظہر ہے اور اس کا آخری حصہ جہنم سے گلوخلاصی ہے۔

اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے آ رہا ہے: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ﴾ کہ جنت اور دوزخ کے مابین ایک فصیل حائل کر دی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا۔ ﴿بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ اس دروازے کے اندر رحمت ہوگی اور باہر عذاب۔ تو باطن کے لئے بھی نسبت درکار ہے کہ کس شے کا باطن' اور ظاہر کے لئے بھی نسبت درکار ہے کہ کس شے کا ظاہر! ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ میں اس شے کا ذکر نہیں کیا گیا' لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو وہ ایک ہی شے ہو سکتی ہے کہ کل سلسلۂ کون و مکاں' یہ کل تخلیق کا سلسلہ! اس سلسلہ کا اوّل بھی اللہ ہے' اس کا آخر بھی اللہ ہے' اس کا ظاہر بھی اللہ ہے اور اس کا باطن بھی اللہ ہے' لیکن چونکہ قرآن مجید فلسفیانہ انداز اختیار کرنا نہیں چاہتا' لہٰذا وہ الفاظ اختیار کئے گئے جن کو ایک عام آدمی' ایک بدو بھی پڑھ کر گزر جائے اور اسے کوئی اشکال نہ ہو۔ اور اگر اسے زیادہ ہی دقت ہو تو اس حدیث نبویؐ کے حوالے سے اس کی مشکل حل ہو جائے گی اور وہ بڑی سہولت کے ساتھ یہاں سے گزر جائے گا:

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَیْءٌ

لیکن حقیقت میں کائنات کے اس پورے سلسلۂ تخلیق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ربط یہ ہے کہ وہ اس کا غیر نہیں ہے۔

معیتِ الٰہی کا مفہوم

ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہمارے عوام کا ایک عام تصور یہ ہے کہ وہ کسی ایک خاص جگہ پر موجود ہے اور اس کا وجود کائنات میں ہر جگہ نہیں ہے۔ اسی سورۃ مبارکہ کی اگلی آیت میں جو الفاظ آ رہے ہیں: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''اور وہ تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں کہیں تم ہو'' کے بارے میں بالعموم یہ تصور ہے کہ وہ صرف اپنی صفات کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے' ہمیں دیکھ رہا ہے' ہماری باتیں سن رہا ہے۔ یہ تو اس کی تاویل ہوگئی' جبکہ الفاظ تو یہ ہیں: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''اور وہ خود تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو''۔ تو یہ تاویل درحقیقت ان الفاظ کا حق ادا نہیں کر رہی۔ وہ ہمارے ساتھ کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے' لیکن وہ ہمارے ساتھ ہر جگہ' ہر آن موجود ہے۔ اس کے لئے انگریزی میں جو Attributes of God آئے ہیں وہ بہت جامع ہیں۔ وہ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ہے' Omnipotent ہے۔ وہ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ہے' Omniscient ہے۔ جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے' Omnipresent ہے۔

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ یہ الفاظ بالکل واضح ہیں' ان میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ جیسے اللہ کا ہاتھ (يَدُ اللّٰهِ) ایک حقیقت ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ ہے' وہ ایسا ہاتھ نہیں ہے جیسے ہمارا' لیکن کوئی حقیقت تو ہے جس کو "يَدُ اللّٰهِ" سے تعبیر کیا گیا۔ اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے' یہ ہماری وہ مجبوری ہے جو اللہ کی ہر صفت کے بارے میں ہے۔ جیسا کہ میں گزشتہ نشست میں بیان کر چکا ہوں' اللہ دیکھتا ہے' لیکن کیسے دیکھتا ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے! ہمیں کیا پتہ کہ کیسے دیکھتا ہے! اس کی اس طرح کی آنکھیں تو نہیں ہیں جیسی ہماری۔ اس کا دیکھنا اس خارجی نور کا محتاج تو نہیں ہے جس کے ہم محتاج ہیں۔ ہماری بصارت اگرچہ موجود ہو' آنکھ بھی درست ہو' لیکن اگر روشنی نہ ہو تو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے اور اس کے مابین لفظ ''دیکھنا'' مشترک ہے' کہ ہم بھی

دیکھتے ہیں‘ وہ بھی دیکھتا ہے‘ لیکن اس کی نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گویا ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک! ہمارے اور اس کے دیکھنے کی نوعیت میں کوئی آس پاس کا قرب ہے ہی نہیں۔ فارسی کے یہ اشعار ذرا ملاحظہ کیجئے ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم!

''اے وہ ذات تبارک و تعالیٰ جو ہمارے خیال‘ قیاس‘ گمان اور وہم ہر شے سے ماوراء ہے! جو کچھ ہم نے کہا‘ جو کچھ ہم نے سنا اور جو کچھ ہم نے پڑھا‘ ان سب سے تیری ذات بہت بلند اور اعلیٰ و ارفع ہے۔ (ہمارے پاس وہ نطق اور وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جن سے ہم تیرے کسی وصف کو بیان کر سکیں۔) دفتر کے دفتر ختم ہو گئے اور اب ہماری عمر کا سفینہ بھی آخری سرحد کو پہنچا ہوا ہے‘ اس کے باوجود ہم ابھی تیری پہلی صفت ہی کے بارے میں متحیر اور پریشان ہیں (اور ہمیں اس کے بارے میں کوئی تصور اور ادراک نہیں ہو سکا)''۔

متکلمین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفت اوّلین وجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی چھ سب سے اہم اور بنیادی صفات وجود‘ حیات‘ علم‘ ارادہ‘ قدرت اور کلام ہیں‘ بقیہ تمام صفات ان ہی صفات کی شرح ہیں۔ بعض لوگ ان میں سماعت اور بصارت کو بھی شامل کرتے ہیں‘ لیکن سماعت اور بصارت درحقیقت صفت علم ہی کی شرح ہیں۔ تو ان صفات میں سب سے پہلی صفت ''وجود'' ہے‘ جس کے بارے میں کہا گیا ''ما ہم چناں در اوّل وصفِ تو ماندہ ایم!'' یعنی ہم تو تیرے پہلے وصف کے بارے میں ہی متحیر ہیں‘ پریشان ہیں اور اس پر غور کرتے ہوئے ہماری عقل ہمارا ساتھ چھوڑ جاتی ہے ؎

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں جو تشبیہات پیش کی گئی ہیں وہ میں آپ کے

سامنے عرض کر چکا ہوں۔ آپ چاہیں تو توحید وجودی اور وحدت الوجود کو دماغ کا خلل قرار دیں، لیکن اسے کفر اور شرک نہ کہیں، اس لئے کہ نظریہ ''وحدت الوجود'' ہمہ اوست اور Pantheism کے مترادف نہیں ہے۔

علمِ الٰہی کی وسعت و جامعیت

آیت کے آخر میں الفاظ آئے: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۞﴾ ''اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے''۔ جب ہر شے کا اوّل و آخر، ظاہر و باطن وہی ہے تو کائنات کے اندر وہ کہیں دُور نہیں ہے، بلکہ تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ جیسے سورۂ قٓ میں فرمایا: ﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۞﴾ ''ہم تو انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی قریب تر ہیں''۔ یہاں جو فرمایا گیا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہے''، ہم اس کی کُنہہ کو نہیں پہنچ سکتے، اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتے، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ہر جگہ، ہر آن موجود ہے، ہم جہاں کہیں بھی ہوں وہ ہمارے ساتھ ہے، وہ ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اور جب وہ اتنا قریب ہے تو معلوم ہوا کہ ہر چیز کا گویا وہ خود ہی چشم دید گواہ ہے۔ فرشتے نامۂ اعمال کی صورت میں جو رپورٹیں تیار کر رہے ہیں اللہ ان کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تو ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ فرشتوں کی رپورٹیں تو اس لئے تیار ہو رہی ہیں کہ

Justice should not only be done, it should also appear to have been done.

نامۂ اعمال کی یہ فائلیں اس لئے تیار ہو رہی ہیں کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو چیلنج کرے تو اس سے کہا جائے کہ:

﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا ۞﴾ (بنی اسراءیل: ۱۴)

''اپنی کتاب پڑھ لے! تو آج اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔''

یہ سب اتمامِ حجت کے لئے ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود سمیع، بصیر ہے، جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ موجود ہوتا ہے، اس حوالے سے وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ علم اور قدرت اللہ تعالیٰ کی دو بڑی بنیادی صفات ہیں' جن کے بارے میں قرآن حکیم میں بار بار آتا ہے: وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ' وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔لفظ کُل جو ہے یہ درحقیقت ہماری پناہ گاہ ہے۔ہم اس کی قدرت اوراس کے علم کا کوئی اندازہ نہ تو کمیت کے اعتبار سے (quantitatively) کر سکتے ہیں اور نہ کیفیت کے اعتبار سے (qualitatively)۔ہم نہ تو یہ جان سکتے ہیں کہ اسے کتنی قدرت حاصل ہے اور نہ ہی ہم اسے پہچان سکتے ہیں کہ اس کی قدرت کیسے exercise ہوتی ہے۔اس کا علم کتنا ہے اور اسے کیسے حاصل ہوتا ہے' یہ ہم نہیں جان سکتے ۔ان تمام چیزوں سے ہٹ کر ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ چنانچہ ان آیات میں بھی آپ دیکھیں گے کہ صفت علم کو کتنی مرتبہ دہرا کر لایا گیا ہے۔

تخلیق کائنات —— چھ دن میں

آگے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ﴾ ''وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں''۔ یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آسمان اور زمین قرآن کی مستقل تعبیر ہے کل سلسلۂ کون و مکان کے لئے۔ قرآن حکیم کون و مکان جیسی فلسفیانہ اصطلاحات استعمال نہیں کرتا' آسمان اور زمین کے مفہوم کو عام آدمی بھی سمجھتا ہے' لیکن اس سے مراد ہے کل سلسلۂ وجود' کل سلسلۂ مخلوقات' کل سلسلۂ کائنات۔ یہ سب اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں تخلیق فرمایا۔

آسمان و زمین کی چھ دنوں میں تخلیق کا مضمون قرآن مجید میں سات مرتبہ آیا ہے' جس طرح قصۂ آدم و ابلیس بھی قرآن مجید میں سات مرتبہ دہرایا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین چھ دنوں میں پیدا کئے۔ یہاں دن سے مراد کیا ہے؟ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اس سے ہمارا دن مراد نہیں ہے۔ ہماری زمین کی اپنے محور پر ایک گردش جو ہوتی ہے اس سے ہمارا چوبیس گھنٹے کا ایک رات دن وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح ہر سیارے (planet) کا دن دوسرے سے مختلف ہے۔اب ہماری پوری کہکشاں

(Galaxy) کا دن کیا ہوگا؟ کائنات کی ہر شے گھوم رہی ہے' جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ﴾ یہ بہت بڑی astronomical حقیقت ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اگر انسان واقعتاً ادراک کرے تو حیرت ہوتی ہے کہ قرآن حکیم میں چودہ سو برس قبل یہ الفاظ آئے ہیں۔ اُس وقت صحابہؓ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کا کیا مفہوم سمجھا ہوگا' ہم اس کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت انسان پر بتمام وکمال آج منکشف ہوئی ہے کہ ع سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں! کائنات کی کوئی شے ٹھہری ہوئی نہیں۔ ذرّہ (atom) کو دیکھیں تو اس میں بھی electrons مسلسل حرکت میں ہیں اور اسی طرح آپ اپنے نظامِ شمسی کو دیکھیں تو ہر سیارہ گردش میں نظر آتا ہے' جیسے زمین کو کہا گیا ع

''یہ زمیں ' یہ فضا کی رقاصہ!''

زمین گویا رقص کر رہی ہے' خود اپنے محور کے گرد بھی چکر کھا رہی ہے اور سورج کے گرد بھی طواف کر رہی ہے۔ پھر یہ سورج جو اپنے پورے خاندان کو لے کر کسی بہت بڑے star کے گرد چکر لگا رہا ہے' یہ تیسری حرکت ہے۔ پھر ہماری پوری Galaxy حرکت میں ہے۔ چنانچہ ہر شے حرکت میں ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کر دیا: ﴿کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ﴾۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں ایک ہی لفظ ''کُل'' ہماری پناہ گاہ ہے اسی طرح یہاں بھی وہی لفظ ''کُل'' استعمال کیا گیا ہے۔ تو اب اس پوری کائنات کا دن کیا ہوگا؟ قرآن مجید میں کچھ اور دنوں کا بھی تصور ہے' لیکن لازم نہیں ہے کہ وہ مقدار یہاں مراد سمجھی جائے۔ البتہ ایک اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا دن ہے۔ وہ ہماری اس دنیا کے معاملات کی تدبیر فرماتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں پانچ سالہ یا دس سالہ منصوبہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ایک دن کے لئے (جو ہمارے حساب سے ہزار برس ہوتے ہیں) تدبیر کا معاملہ طے ہو جاتا ہے' جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ

اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۞﴾(السجدۃ:۵)

''وہ اپنے امر کی تدبیر کرتا ہے آسمان سے زمین کی طرف' پھر وہ امر اس کی طرف واپس لوٹتا ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے''۔

ایک ہزار برس کی اس مقدار کی غلط تعبیر کرتے ہوئے اکبر کے زمانے میں ابوالفضل اور فیضی جیسے بڑے جغادری علماء نے' جو اقبال کے الفاظ میں لغت ہائے حجازی کے قارون تھے' اکبر کے ایماء پر یہ شوشہ چھوڑا کہ شریعت محمدی کو آئے ہوئے ایک ہزار برس پورے ہو گئے ہیں' لہٰذا اب دینِ محمدیؐ کا دور ختم ہوا اور دین الٰہی کا دور شروع ہو رہا ہے۔

قرآن مجید میں پچاس ہزار سال کے برابر ایک دن کا ذکر بھی موجود ہے اور اس کے بارے میں گمان غالب ہے کہ وہ قیامت کا دن ہے۔ فرمایا: ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾(المعارج:۴) ''ملائکہ اور روح (جبرئیلؑ) اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے''۔ جہاں تک زمین و آسمان کی چھ دنوں میں تخلیق کا معاملہ ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ تخلیق کے ایک دن کو ہم ایک ہزار برس کا قرار دیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ اسے پچاس ہزار برس کا قرار دیں۔ تخلیق کے ان چھ دنوں کی مقدار ہمیں معلوم نہیں ہے' یہ دراصل چھ ادوار ہیں جن کے لئے ہم millenniums یا eras کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

خالق بھی وہی' حاکم بھی وہی

آگے فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ ''پھر وہ عرش پر جلوہ افروز ہوا''۔ ایسا ہرگز نہیں کہ تخلیق فرما کر وہ کہیں علیحدہ بیٹھ گیا ہو' بلکہ وہ تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ بعض صوفیاء کا تصور بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی ذات میں مگن ہے' اسے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ کائنات میں کیا ہو رہا ہے' وہ اس سے مستغنی ہے۔ چنانچہ مشائین (جو ارسطو کی منطق کے پیروکار ہیں) یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالمِ کلیات ہے' عالم جزئیات

نہیں ہے۔ یہی گمراہی اس وقت جدید سائنسی تصورات اور مادہ پرستی کے زیر اثر پھیل رہی ہے۔ دَورِ جدید کا سب سے بڑا شرک تو انسانی حاکمیت کا تصور ہے' جبکہ اس کے ساتھ دوسرا بڑا شرک مادیت پرستی ہے۔ اس مادیت پرستی نے انسانی ذہن کو اتنا گرفت میں لے لیا ہے کہ جو خدا کو مانتا ہے وہ بھی اس معنی میں مانتا ہے کہ کائنات کا خالق (creator) تو وہ ہے' لیکن اس کی تخلیق کے بعد اس نے کچھ طبعی قوانین (physical laws) بنا دیئے ہیں جن کے تحت یہ کائنات خود بخود چل رہی ہے۔ چنانچہ ہر لحظہ' ہر آن اللہ کا فیصلہ اور اس کا اِذن ان کے تصور سے ماورا ہے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اسے ''اللہ کی تعطیل'' کہتے ہیں' یعنی اللہ کو معطل کر دینا۔ گویا کائنات کی تخلیق کے بعد اب وہ معطل ہے' اسے اس کائنات کی روز بروز اور لحہ بہ لحہ working سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس نے جو قوانین بنا دیئے ان کے تحت کائنات کا نظام از خود چل رہا ہے' جیسے فٹ بال کا کوئی کھلاڑی فٹ بال کو ٹھوکر لگائے تو وہ گیند دوڑتی چلی جاتی ہے جب تک کہ کوئی مزاحمت اسے نہ روکے۔ اس گیند کو آگے بڑھانے میں اب اس کھلاڑی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا جس نے اسے کک لگائی تھی۔ جبکہ ایمان اور قرآن ہمیں اللہ تعالیٰ کی یہ معرفت دیتے ہیں کہ وہ تختِ حکومت پر متمکن ہے اور نظامِ کائنات کو کنٹرول کر رہا ہے' جیسا کہ ابھی ہم نے پڑھا: ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ﴾ یہاں تک کہ اس کے اِذن کے بغیر پتہ تک جنبش نہیں کر سکتا۔ یہ تصور جب تک نہ ہو تو انسان کو ایمان باللہ اور معرفتِ ربّ حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ مفہوم ہے جو یہاں دیا گیا ہے: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾

اللہ تعالیٰ عالمِ کلیات ہی نہیں عالمِ جزئیات بھی ہے

آیت کے اگلے الفاظ میں ان جہلاء کے نظریات کی نفی ہو رہی ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ جزئیات کا عالم نہیں۔ قرآن نے یہ جو حقیقت بیان کی ہے اس سے فلسفہ و سائنس کی بہت سی گمراہیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اور بہت سے عقدے حل ہو جاتے ہیں۔ فرمایا: ﴿یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ

زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے''۔ زمین میں داخل ہونے والی شے بارش کا وہ قطرہ بھی ہے جو جذب ہو رہا ہے اور وہ بیج بھی ہے جو کسی درخت کا پھل سوکھنے کے بعد اس سے نکلتا ہے اور زمین میں قرار پکڑ لیتا ہے۔ ان دونوں کے نتیجے میں زمین سے جو کونپل پھوٹتی ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے۔ اسی طرح زمین میں داخل ہونے والے مردے بھی ہیں جو زمین میں مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہو رہے ہیں' لیکن پھر وہ یہیں سے زندہ کر کے نکالے جائیں گے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى ۞﴾(طٰہٰ: ۵۵) ''اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے' اسی میں ہم تم کو واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے''۔ چنانچہ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی شے جو زمین میں داخل ہو رہی ہے اور جو اس سے نکل رہی ہے یا نکلے گی وہ اس کے علم میں ہے۔

﴿وَمَا يَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعۡرُجُ فِيۡهَا﴾ ''اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے (وہ بھی اس کے علم میں ہے)''۔ آسمان سے نازل ہونے والی بارش بھی ہے اور فرشتے بھی جو آسمان سے اترتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ فِيۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ مِّنۡ كُلِّ اَمۡرٍ﴾ ''اترتے ہیں اس رات میں فرشتے اور روح اپنے ربّ کے اِذن سے ہر حکم لے کر''۔ تو فرشتے اللہ تعالیٰ کے احکام لے کر ان کی تنفیذ کے لئے اترتے ہیں اور یہاں سے رپورٹ لے کر اور ارواحِ انسانیہ کو لے کر اوپر جاتے ہیں۔ پس جو کچھ یہاں ہو رہا ہے ہر شے اللہ کے علم میں ہے۔ گویا کہ احاطہ کر لیا گیا کہ کوئی شے اللہ کے علم سے باہر نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر اس کی وضاحت ان الفاظ میں آئی ہے: ﴿وَيَعۡلَمُ مَا فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ؕ وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعۡلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ ۞﴾(الانعام: ۵۹) ''بحر و بر میں جو کچھ ہے وہ اس سے واقف ہے۔ کسی درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب کچھ ایک کھلی

کتاب میں لکھا ہوا ہے''۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ صرف کلیات کا عالم نہیں بلکہ جزئیات کا بھی عالم ہے' زمین و آسمان اور بحر و بر کا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اس کے علم میں ہے۔ یہ بات اگرچہ ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتی' لیکن ایمان کا جزوِ لازم ہونے کی حیثیت سے اس پر ایمان رکھنا ناگزیر ہے۔

معیتِ الٰہی کی کیفیت؟

آگے فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو''۔ سورۃ الحدید کی ان چھ آیتوں میں پہلی دو' درمیان کی دو اور آخری دو آیتوں پر مشتمل تین جوڑے ہیں اور ان کے اوّل و آخر میں ایک مناسبت ہے۔ درمیانی دو آیات (۳'۴) اہم ترین ہیں۔ تیسری آیت میں وہ الفاظ آئے ہیں: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ اور چوتھی آیت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو''۔ اس کا تعلق بھی فلسفۂ وجود سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے ہم جہاں کہیں بھی ہوں —— لیکن کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ ہم اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتے۔ بعض لوگوں نے اپنی ذہنی سطح کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں تجسیم کا تصور قائم کیا ہے کہ وہ کسی جہت' کسی مکان' کسی مقام پر محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ایسا تصور معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' بالکل درست نہیں ہے۔ وہ تو ہر آن' ہر جگہ موجود ہے' البتہ کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ اس کی ذات مطلق ہے' وہ کسی جگہ محدود نہیں ہے۔ جب کسی معاملے میں شدت آ جاتی ہے تو انسان ایک انتہا سے دوسری انتہا تک چلا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے! حدیث قدسی میں الفاظ آتے ہیں کہ رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ سمائے دنیا تک نزول فرماتے ہیں اور وہاں سے ندا لگتی ہے کہ:

هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاُغْفِرَ لَهُ؟

هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَاُعْطِيَهُ؟

''ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اسے معاف کروں؟ ہے کوئی مانگنے والا کہ

میں اسے عطا کروں؟''

ہمیں معلوم ہے کہ سات آسمان ہیں' ساتویں آسمان کے اوپر پھر عرش کی کرسی ہے' رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ عرش سے سمائے دنیا یعنی پہلے آسمان تک نزول فرماتا ہے۔ اس نزول کی کیفیت ہم نہیں جانتے۔

اب اس کے بارے میں کچھ لوگ اس انتہا پر ہیں کہ وہ اس کی مطلق نفی کر دیتے ہیں کہ اللہ کے نزول کا کیا سوال؟ اللہ کسی خاص جگہ پر محدود تو نہیں ہے کہ وہاں سے نیچے اترے! اور ایک انتہا یہ ہے کہ امام ابن تیمیہؒ منبر پر کھڑے تقریر کر رہے تھے اور ان لوگوں کی نفی کرتے ہوئے ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے اترے اور کہا کہ اللہ ایسے اترتا ہے جیسے میں اترا ہوں۔ یہ دوسری انتہا ہے۔ ہم اپنے اترنے پر اللہ کے اترنے کو قیاس کریں تو یہ غلط ہے۔ ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نزول فرماتا ہے لیکن ہم اس کی کیفیت معین نہیں کر سکتے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تجلیات کسی خاص مقام پر مرکوز ہو سکتی ہیں' اللہ کی ذات کسی مقام پر محدود نہیں ہے۔ اللہ کی تجلیاتِ خصوصی ہیں جو کرسی پر ہیں' جو عرش پر ہیں' جو ساتویں آسمان کے اوپر ہیں' جس کے بارے میں سورۃ النجم میں آیا ہے:
﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۞ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۞﴾ (۱۴'۱۵) ''سدرۃ المنتہیٰ کے پاس' اس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے''۔ مکان اور مکانیت کی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے' ہم ذاتِ باری تعالیٰ سے ان چیزوں کو بالکل منقطع بھی نہیں کر سکتے' ورنہ تو ہم قرآن مجید کی ہر آیت کی تاویل کرتے چلے جائیں گے' پھر تو ہر چیز استعارہ بن کر رہ جائے گی' لیکن اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے کسی مقام پر محدود نہیں ہے' وہ اس کی خصوصی تجلی ہے جو کسی مقام پر مرکوز ہے۔ چنانچہ ان ہی انوار کا ذکر بایں الفاظ کیا گیا: ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۞﴾ ''جبکہ اس سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانپے ہوئے تھا' جو ڈھانپے ہوئے تھا''۔ ہم تو یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کیا ڈھانپتے ہوئے تھا جس کے لئے قرآن مجید نے مبہم الفاظ استعمال کئے ہیں۔ تم کیا سمجھو گے کہ کیا ڈھانپے ہوئے تھا؟ تمہارے سامنے وہ بات بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس کا مشاہدہ حضور ﷺ نے اس شان

کے ساتھ کیا کہ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴾ ''نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی''۔ ﴿لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی ﴾ ''اس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا''۔ وہ بیری کو ڈھانپنے والی اللہ ربّ العزت کی تجلیاتِ خصوصی تھیں' جو اُس وقت وہاں نزول فرما رہی تھیں اور حضور ﷺ نے ان کا مشاہدہ کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تجلیاتِ خصوصی کا کعبۃ اللہ پر ارتکاز ہے۔ چنانچہ اللہ کی تجلی مختلف مقامات پر ہوسکتی ہے' لیکن جہاں تک ذاتِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے اس کے ساتھ اگر کسی جسمانیت' کسی جہت یا کسی مقام کا تصور کیا جائے تو میرے خیال میں یہ اللہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ ﴿وَهُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ﴾ ''اور جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے''۔ اگرچہ ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کیسے ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے' معیت کو ہم جانتے ہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی ہم ہوتے ہیں۔

اعمالِ انسانی کا چشم دید گواہ

﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴾ ''اور جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے''۔ جب وہ ہر جگہ' ہر آن تمہارے ساتھ ہے تو جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اسے خود دیکھ رہا ہے۔ وہ تمہارے سب اعمال کا چشم دید گواہ ہے۔ آگے چل کر دسویں آیت کے اختتام پر الفاظ آتے ہیں: ﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴾ ''جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے''۔ یہ دونوں جملے اسی ترتیب سے سورۃ التغابن میں بھی آتے ہیں۔ بصارت اور خبر کے متعلق ہمارا عمومی تصور یہ ہے کہ بصارت یقین کا آخری درجہ ہے' جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو گویا یقین کا آخری درجہ حاصل ہو گیا' لیکن قرآن مجید میں جو ترتیب آتی ہے اس میں ''بصیر'' کو ''خبیر'' سے مقدم کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے صفت بصارت کا ذکر آتا ہے' بعد میں صفت خبر کا۔ اس لئے کہ خبر اصل شے ہے' کیونکہ آنکھ بھی دھوکہ دے سکتی ہے ؏

ہر چہ می بینیم یارب بہ بیداری ست یا بخواب؟

آدمی بعض اوقات کشش و پنج میں پڑ جاتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں واقعتاً صحیح دیکھ رہا ہوں؟ کچھ illusions بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اصل خبر وہ ہے جو انسان کے باطن کے اندر پہنچ جائے۔ بہرحال خبر کی طرح بصارت بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا بہت بڑا مظہر ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کے ضمن میں اہلِ ایمان کی ذِمّہ داری

پھر فرمایا: ﴿لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''اسی کے لئے زمین وآسمان کی بادشاہی ہے''۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے ضمن میں جو بھی بڑے بڑے مسائل ہیں' جو بھی فلسفیانہ مشکلات ہیں اور جو بھی مغالطے ہیں وہ سب ان چھ آیات میں حل کیے گئے ہیں۔ ان چھ آیات میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اس سے اندازہ ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تصور کو قرآن مجید کتنا emphasize کرنا چاہتا ہے۔ سارا فساد تو اسی کا ہے کہ انسان خود حاکم بن کر بیٹھ گیا ہے اور اسی کا نام بغاوت ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ کی ہے اور زمین پر اس حکومت کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد میں اپنا تن من دھن لگا دینا اللہ اور اس کے رسولؐ کے ماننے والوں کا گویا فرضِ منصبی ہے۔ چنانچہ ان چھ آیات کے بعد جب مطالبات آئیں گے تو اہل ایمان سے انفاقِ مال اور بذلِ نفس کا مطالبہ کیا جائے گا:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾

''ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے''۔

اللہ کی راہ میں لگا دو' کھپا دو اور خرچ کر دو ان تمام چیزوں میں سے جن پر ہم نے تم کو اختیار دیا ہے' تمہیں استخلاف عطا کیا ہے۔ لیکن یہ انفاق' لگانا' کھپانا' خرچ کرنا' جان کا کھپانا' مال کا خرچ کرنا' اپنی صلاحیتیں' اپنی ذہانت' اپنے اوقات لگا دینا' اپنے آپ کو

ہمہ تن کھپا دینا کس لئے؟ تا کہ اللہ کا حق بحال (restore) کرایا جائے۔ اس کی حکومت کے اندر بغاوت ہوگئی ہے' انسان اپنی حاکمیت کے مدعی بن کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ یہ اس زمین کے بادشاہِ حقیقی کے خلاف عالمگیر بغاوت ہے۔ اور اب انسانی حاکمیت (Human Sovereignty) حاکمیت جمہور (Popular Sovereignty) میں تبدیل ہو چکی ہے اور یہ نجاست اب عالمی سطح پر جڑ پکڑ چکی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ یہ فساد بر و بحر کے اندر رونما ہو چکا ہے اور اب یہ نجاست ایک نظریہ کے طور پر تمام انسانوں کے اندر تقسیم کر دی گئی ہے۔ پہلے ایک شخص فرعون یا نمرود کی صورت میں حاکمیت کا دعویٰ کرتا تھا کہ "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" مگر آج وہ ٹنوں گندگی تولہ تولہ ماشہ ماشہ عام آدمی کو بھی پہنچا دی گئی ہے۔ یہ ہے اصل گمراہی' اصل بغاوت اور اصل فساد۔ اور جو اللہ کا وفادار ہے اس کا فرضِ عین قرار پاتا ہے کہ اس بغاوت کا قلع قمع کرے اور اللہ کا حق اس کو لوٹائے' تا کہ زمین پر اللہ کی حاکمیت بالفعل قائم ہو جائے۔

فیصلے کا اختیار اللہ کا!

اس سورۂ مبارکہ کی دوسری آیت میں ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کے بعد ارشاد ہوا تھا: ﴿يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ "زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے"۔ اس لئے کہ حکومت کے ساتھ ایک لازمی تصور قدرت و اختیار کا ہے۔ وہ حکومت ہی کیا جو مجرموں کو سزا نہ دے سکے اور وفاداروں کو بدلہ نہ دے سکے' انہیں کوئی انعامات نہ دے سکے! اگر کسی حکومت کو جزا و سزا کا اختیار نہیں اور وہ معاملات کا فیصلہ کرنے کے قابل نہیں تو وہ حکومت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں اس پہلو کو نمایاں کیا گیا: ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝﴾ "اور تمام معاملات (فیصلے کے لئے) بالآخر اسی کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے"۔ اُس کے حضور میں پیش کر دیئے جائیں گے۔ آخری فیصلے وہاں ہوں گے۔ اس روز یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ وہ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ "جزا و سزا کے دن کا مالک" ہے۔ اس روز

آنکھوں پر پڑے پردے ہٹ جائیں گے۔ اس روز کہا جائے گا: ﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴾(ق:۲۲) ''آج ہم نے تمہاری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا ہے اور آج تمہاری نگاہ خوب تیز ہے''۔ دیکھ لو آج کے دن کس کے لئے بادشاہی ہے؟ تم دنیا میں اپنی بادشاہی کے دعوے دار تھے۔ ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ آج کے دن بادشاہی صرف اس اللہ کے لئے ہے جو الواحد اور القہار ہے۔ تو یہاں فرمایا گیا: ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ ''اور تمام معاملات فیصلے کے لئے اسی کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے''۔ تُرْجَعُ فعل مجہول ہے۔ یہاں تَرْجِعُ نہیں ہے' یعنی خواہی نخواہی تمام معاملات اس کے حضور پیش کر دیئے جائیں گے' تم چاہو یا نہ چاہو تمام معاملات اللہ کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے اور آخری فیصلے کے لئے اسی کی عدالت میں پیشی ہو گی۔

گردشِ لیل و نہار میں انسان کے لئے سامانِ معرفت

﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ ﴾ ''وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں''۔ یہ قرآن مجید کی ایک صنعت لفظی ہے کہ ایک ہی مادے سے بننے والے الفاظ کا استعمال قریب قریب ملتا ہے۔ اسی کی ایک مثال یہاں ہے۔ چنانچہ ابھی ہم نے پڑھا: ﴿ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِى الْاَرْضِ﴾ ''وہ جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتا ہے''۔ وَلَجَ ' يَلِجُ ثلاثی مجرد سے ہے۔ اسی مادے سے باب افعال میں اَوْلَجَ ' يُوْلِجُ اِيْلَاجًا ہے۔ یعنی کسی شے کو کسی میں داخل کرنا۔ فرمایا: ﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ ﴾ ''وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں''۔ اس کا اصل مفہوم سمجھئے۔ یہ مضمون بھی دراصل دوسری مرتبہ آ گیا ہے۔ پہلے ہم نے پڑھا: ﴿يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ ''وہی مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے''۔ اگر ہم کہیں ''نَمُوْتُ وَنَحْيَا '' کہ ہم خود زندہ رہتے ہیں' خود مرتے ہیں تو یہ کفر ہے' محجوبیت ہے' غفلت ہے۔ گویا کہ اللہ سے بُعد ہے۔ یہ یقین کہ اللہ زندہ رکھتا ہے' اللہ ہی مارتا ہے' یہی معرفت' ہدایت اور ایمان ہے۔ سائنس کے زیر اثر ہماری

سوچ یہ بن گئی ہے کہ رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آ رہے ہیں۔ گویا کہ خود بخود آ رہے ہیں۔ چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ کائنات کا نظام خود بخود چل رہا ہے۔ بنانے والے نے ابتدائے آفرینش میں کچھ قوانین بنا دیئے تھے' جن کے زیر اثر اب یہ نظام خود بخود نظام چل رہا ہے۔ اس تصور کی نفی کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ﴾ ''وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں'' ﴿وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ ''اور وہ داخل کرتا ہے دن کو رات میں'' اس نے زمین' سورج اور چاند کی گردش کا پورا نظام قائم کیا جس کے نتیجے میں دن رات ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں۔

فرض کیجئے اگر سورج ایک جگہ کھڑا رہتا تو ہر چیز روشن ہوتی' لیکن شاید انسان کو یہ معلوم نہ ہو سکتا کہ روشنی سورج سے آ رہی ہے۔ اس لئے کہ ہر چہار طرف روشنی سے یہ مغالطہ ہو سکتا تھا کہ ہر شے از خود روشن ہے۔ یہ تو سورج حرکت کرتا ہے اور سایہ اس کے ساتھ گھٹتا بڑھتا ہے تو ہمیں معلوم ہو رہا ہے کہ روشنی اصل میں سورج کی ہے۔ جب سورج غروب ہو جاتا ہے اور روشنی ختم ہو جاتی ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ روشنی دراصل سورج کی روشنی ہے۔ یہی معاملہ ان چیزوں کا ہے جو بظاہر خود بخود ہو رہی ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہم کھانا کھاتے ہیں تو بھوک مٹ جاتی ہے۔ بھوک سے کمزوری محسوس ہو رہی تھی' کھانے سے توانائی آ گئی' ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس کھانے میں یہ تاثیر ہے کہ اس سے جسم میں قوت آ جاتی ہے۔ اسی طرح پانی پیاس ختم کرتا ہے' ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پانی کی تاثیر ہے کہ پیاس بجھ جاتی ہے۔ اب اللہ ہمارے ذہن سے نکل گیا اور ہم اللہ سے محجوب ہو گئے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ امام رازیؒ نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ جو عقولِ اعلیٰ یعنی بلند سطح کی عقول کے حامل لوگ ہیں' جن کو حقائق مستحضر رہتے ہیں' ان کا کہنا یہ ہے کہ:

مَا رَاَيْتُ شَيْئًا قَطُّ وَقَدْ رَاَيْتُ اللّٰهَ قَبْلَهٗ

''میں جس شے کو بھی دیکھتا ہوں مجھے اس سے پہلے اللہ نظر آتا ہے''۔

اور جو عقولِ متوسطہ کے حامل ہیں وہ یہ کہتے ہیں:

مَا رَاَیْتُ شَیْئًا قَطُّ وَقَدْ رَاَیْتُ اللّٰہَ مَعَہٗ

''میں نے جب بھی کسی شے کو دیکھا' مجھے اس کے ساتھ ہی اللہ نظر آیا۔''

اور ایک قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی عقول ادنیٰ درجے کی ہوتی ہیں' وہ کہتے ہیں کہ

''مَا رَاَیْتُ شَیْئًا قَطُّ وَقَدْ رَاَیْتُ اللّٰہَ بَعْدَہٗ

''جب بھی میں نے کسی شے کو دیکھا تو اس کے بعد مجھے اللہ نظر آیا''۔

کسی شے کو دیکھنے کے بعد اللہ یاد آ جائے تو یہ گویا معرفت کی سب سے نچلی شکل ہے' لیکن اللہ کی تخلیق کو دیکھتے رہیں اور اللہ نظر ہی نہ آئے تو یہ محجوبیت ہے' گمراہی ہے' یہ اللہ سے اوٹ میں ہو جانا ہے۔ سورۃ المطففین میں فرمایا:

﴿کَلَّآ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ۝﴾ (آیت ۱۵)

''بے شک یہ لوگ اُس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے اوٹ میں ہوں گے''۔

قیامت کے دن وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محجوب رہ جائیں گے' محروم کر دیئے جائیں گے' اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ نہ کر پائیں گے' جس طرح اس وقت دنیا میں محجوب ہیں۔ وہ اشیاء کو دیکھ رہے ہیں لیکن اللہ کو نہیں دیکھ رہے ہیں' جبکہ حقیقت میں جس کے دل میں اللہ موجود ہے' معرفت کے کسی درجے میں اسے ایمان باللہ حاصل ہے' اسے اللہ ہر جگہ' ہر آن' ہر لحظہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن اللہ کا یہ تصور رکھتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے از خود نہیں ہو رہا' میرے اللہ کے کرنے سے ہو رہا ہے۔ یہ اُس کا فیصلہ ہے ؏ ہر چہ ساقی ماریخت عین الطاف است! میرے اللہ نے جو کچھ میری جھولی میں ڈال دیا ہے یہ اس کا لطف و کرم ہے' اس کی عطا ہے' اس کی دین ہے' اور اس میں یقیناً خیر ہی خیر ہے۔

اب دیکھئے کہ ﴿یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ ﴾ کا مفہوم کیا ہے! ''وہ پرو لاتا ہے رات کو دن میں اور پرو لاتا ہے دن کو رات میں''۔ رات کو دن میں اور دن کو رات میں پرونے کا مفہوم سمجھ لیجئے۔ ایک تصور تو یہ ہے کہ جیسے ایک دھاگے میں تسبیح کے دانے پروئے ہوئے ہیں اور ایک ایک دانہ گر رہا ہے۔ سیاہ دانہ گرا تو یہ رات ہے اور سفید دانہ گرا تو یہ دن ہے۔ گویا ؏ میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا

ہوں دانہ دانہ! اور ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ کبھی دن بڑھتا ہے' رات گھٹتی ہے تو گویا دن رات میں داخل ہو رہا ہے اور کبھی دن گھٹتا ہے اور رات بڑھتی ہے تو گویا رات دن میں داخل ہو رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا جامع بیان

آیت کے آخری الفاظ ہیں: ﴿ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۞ ﴾ ''اور وہ سینوں کے پوشیدہ راز تک جانتا ہے''۔ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے وہ اس کا جاننے والا ہے۔

سورۃ الحدید کی یہ چھ آیات اللہ تعالیٰ کے اسماءِ صفات اور اس کی معرفت کے بیان میں بہت اہم ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفت علم نہایت جامعیت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ سب سے پہلے فرمایا:

﴿ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۞ ﴾ (آیت ۳)

''اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے''۔

پھر اگلی آیت میں اس وضاحت کے بعد کہ وہ صرف کلیات ہی کا عالم نہیں' جزئیات سے بھی پوری طرح واقف ہے' فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۞ ﴾

''اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے''۔

اور اب یہاں فرمایا کہ یہی نہیں' بلکہ:

﴿ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۞ ﴾

''وہ تو اسے بھی جانتا ہے جو تمہارے سینوں میں مخفی ہے''۔

اور آیت ۱۰ کے آخر میں آئے گا:

﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۞ ﴾

''اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے''۔

اس طرح اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں علم خداوندی کا ذکر کتنے مختلف اسالیب اور کتنے مختلف dimensions سے کیا گیا ہے۔

سورۂ تغابن میں اللہ تعالیٰ کے علم کو تین اسلوبوں سے ایک ہی آیت میں بیان کیا

گیا ہے: ﴿يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے'' ﴿وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ﴾ ''اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو''۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے جو سینوں میں پوشیدہ ہے''۔ وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے' وہ علیم بذات الصدور ہے۔

آخری بات یہ نوٹ کیجئے کہ سلسلۂ مُسبحات میں سے اوّلین سورۃ الحدید ہے' جسے ''اُمّ المسبحات'' کا درجہ حاصل ہے' جبکہ مُسبحات میں سے آخری سورۂ تغابن ہے' جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ سورۂ تغابن کا عنوان ہی ''ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات'' ہے۔ سورۃ الحدید کے جو مضامین ہم پڑھ چکے ہیں ان میں سے بعض مضامین وہاں تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علم' قدرت اور حکومت' تینوں کا وہاں ذکر ہے۔ البتہ فلسفیانہ مضامین صرف یہیں ہیں۔

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾

اور

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾

یہ درحقیقت فلسفۂ وجود کی سطح پر معرفت خداوندی کی بلند ترین منزل ہے اور یہ بحث قرآن مجید میں صرف اسی مقام پر آئی ہے۔

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم